غالبؔ اور سارتر

محمد اسرار خان، شعبۂ اُردو، اسلام آباد ماڈل پوسٹ گریجویٹ کالج، اسلام آباد

Abstract

Sartar,s philosophy of existantialism had a far reaching effect on the literature of 20 century. But this notion is very thought provoking that many elements of his philosophy already existed in the philosophy of Ghalib. In this article it has been tried to prove that Sartar,s philosophy is not new to the readers of East, because it is present in Ghalib,s philosophy in a scattered form.

غالبؔ اور سارتر مشرق اور مغرب کے دو اہم نام ہیں۔ غالبؔ انیسویں صدی کے مشرقی ادب میں بڑے شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں، جبکہ سارتر بیسوی صدی کے مغربی فلسفے کے ارتقائی سفر میں اہم موڑ کی حیثیت رکھتے ہیں، جن کا فلسفہ ''وجودیت'' تاحال مغربی اور مشرقی ادب پر اثر انداز ہو رہا ہے۔مشرقی ادب میں غالبؔ کے ادبی سفر کا دورانیہ ۱۷۹۷ء سے ۱۸۶۹ء تک، جبکہ مغربی فلسفے میں سارتر کا دورانیہ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۸۰ء تک بنتا ہے۔یعنی غالبؔ سارتر سے بہت پہلے اس عالمِ ہستی میں وارد ہو کر اپنی تخلیقی صلاحیتیں منوا چکے ہیں۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ اکثر مشرقی اور مغربی ناقدین نے ہمیشہ سے مغربی ادباء وشعراء کو مشرقی ادباء وشعراء پر فوقیت دی ہے، اور ایسا تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ مشرق ہمیشہ سے مغربی افکار کی تقلید کرتا چلا آیا ہے اور اکثر ناقدین کے مطابق جو افکار مشرقی ادب میں اثر ونفوذ کرتے ہیں وہ پہلے مغربی ادب میں بار پا چکے ہوتے ہیں،لیکن یہ تاثر درست نہیں۔اس حوالے سے اگر صرف غالبؔ کے افکار کا تجزیہ ہی کیا جائے تو اُن کے یہاں ایسے بے شمار مضامین نکل آتے ہیں، جو مغربی ادباء وفلاسفہ کے مقابلے میں بالکل نئے اور اچھوتے لگتے ہیں اور جن تک مغربی مفکرین کی رسائی تک نہیں ہوئی۔اور ایسے افکار کی بھی کمی نہیں، جن کا تذکرہ غالبؔ نے پہلے کیا، جبکہ مغربی ادباء وفلاسفہ نے انھیں اپنے نظامِ فکر میں بہت بعد میں جگہ دی۔اس سلسلے میں سید محمد محمود رضوری مخمورؔ اکبرآبادی کی رائے خاصی فکر انگیز ہے:

> ''علومِ طبیعیات وحیات وفلسفے کی نظر سے لامارک اور ہیگل نے دُنیا کو ان رموز سے آگاہ وآشنا کیا ہے۔ہم اگر غالبؔ کے بتائے ہوئے ان رموز و بصائر کو اپنے خون میں ملا جلا لیں،تو پھر لامارک، ہیگل، گوئٹے اور نطشے کے فکری انکشافات اتنی نئی بات نہیں رہتے کہ ہم ان سے یکا یک چونک پڑیں۔''[۱]

سارتر کا فلسفۂ وجودیت بیسویں صدی کے مغربی ادب کے ساتھ ساتھ مذہب اور سیاست پر بھی اثر انداز ہوا۔اس فلسفے نے منظرِ عام پر آکر دُنیائے ادب میں تہلکہ مچا دیا اور مغربی ادب کے ساتھ ساتھ مشرقی ادب پر بھی اپنے دور رس اثرات مرتب

کیے۔لیکن یہ امر خاصا ہوش رُبا ہے کہ جس فلسفے کی تبلیغ سارتر بیسویں صدی میں کرتے رہے، اس کے بہت سے عناصر غالب کے ہاں بہت پہلے سے موجود ہیں۔البتہ فرق صرف اتنا ہے کہ غالب کے یہاں یہی فلسفہ ان کی نجی زندگی اور شخصی افکار کے رنگ میں منتشر صورت میں ملتا ہے، جبکہ سارتر نے اس کو باقاعدہ اور منظّم تحریک کی صورت میں پیش کیا۔ وجودیت بیسویں صدی میں انسانی زندگی کے مختلف مسائل مثلاً انتشار، بے چینی، مایوسی، مادیت پرستی، عالمی جنگوں کی خونریزی، بربریت اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے بحران کی پیداوار ہے۔

زندگی کے ارتقائی سفر میں انسان نے مختلف اوقات میں اپنے مسائل کو مختلف طریقوں سے حل کرنے کی کوشش کی۔ انسان نے کبھی مذہب تو کبھی فلسفہ، کبھی عقل تو کبھی سائنس کی ترقی کی صورت میں مسائل کو سمجھا، پرکھا اور ان کا حل تلاش کیا۔ مذہب، فلسفہ اور عقل جب انسان کے مسائل حل کرنے میں ناکام رہے تو سترھویں اور اٹھارویں صدی میں سائنس کی حیرت انگیز ترقی دیکھ کر یہی انسان سائنس پرستی کا شکار ہو گیا۔ گو سائنس نے ایک طرف تو مسائل کا حل دریافت کیا، لیکن دوسری طرف انسان کی مکمل تباہی کا نقشہ بھی پیش کیا۔ بیسویں صدی کی دو عظیم جنگوں کی تباہ کاریوں نے نسلِ نو کو شدید ہیجانی کیفیت سے دوچار کیا۔ زندگی کے اس بھیانک موڑ پر جب بیسویں صدی کے جدید انسان کا اعتماد بری طرح مجروح ہوا تو اسے ایسی قوت کی ضرورت شدت سے محسوس ہونے لگی جس کے ذریعے وہ اپنے کھوئے ہوئے اعتماد کو بحال کرے اور اپنے گم شدہ وجود کو دوبارہ پا سکے اور وہ قوت اسے وجودیت کی شکل میں مل گئی۔

انیسویں اور بیسویں صدی کا یہ انتشار فکر و نظر پر بھی اثر انداز ہوا۔مختلف مفکرین نے فرد کی داخلیت کی طرف متوجہ ہو کر داخلی مسائل سلجھانے کی کوشش کی۔ دیگر مکتبِ فکر کے ساتھ ساتھ سوفسطاؤں، سقراط، اکیاوینس، پاسکل اور جان لاک (۱۶۳۲ء۔۱۷۰۴ء) نے فرد کی داخلیت اور اندرونی جذبات و احساسات کو بنیادی اہمیت دی تھی۔لیکن جب ہیگل (۱۷۷۰ء۔۱۸۳۱ء) نے ایک بار پھر خارجیت کو توجہ دے کر داخلیت کو نقصان پہنچایا تو اس کے ردعمل میں سورین کرکیگارڈ (۱۸۱۳ء ۔ ۱۸۵۵ء) نے وجودیت کا فلسفہ پیش کر کے ہیگل کے نظریات کی نفی کر دی۔ شاید اس لحاظ سے سورین کرکیگارڈ کو فلسفۂ وجودیت کا بانی قرار دیا جاتا ہے۔کرکیگارڈ دین کے معاملے میں عقل کے مخالف تھے۔ان کے نزدیک عقل خاص چیزوں کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ ان کے مطابق موضوعیت ہی سچائی ہے، کیونکہ یہ داخل کا معاملہ ہے اور یہی داخلی موضوعیت ہے۔عجیب بات ہے کہ کرکیگارڈ جیسے مذہبی فلسفی کا اثر جس فلسفی کے ذریعے عام ہوا وہ ملحد فلسفی ہائیڈیگر (۱۸۸۹ء۔۱۹۷۵ء) تھے۔

یہاں ایک سوال اُٹھایا جا سکتا ہے، کہ سورین کرکیگارڈ چونکہ غالب کے ہم عصر تھے تو عین ممکن ہے کہ وجودیت کا فلسفہ غالب نے ان سے مستعار لیا ہو، لیکن یہ اس لیے ممکن نہیں کہ ایک تو غالب انگریزی زبان سے قطعی نابلد تھے، دوسرا دونوں کے مابین مکانی فاصلے بھی کچھ کم نہیں تھے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر سید عبداللہ کی رائے کافی اہمیت کی حامل ہے۔وہ لکھتے ہیں:

> ''تخلیقات کی جزوی مماثلتیں کسی دوسرے فن کار سے براہِ راست استفادہ یا جذب و اثر کے بغیر بھی ممکن ہیں۔مثلاً گوئٹے اور غالب یا اقبال اور گوئٹے کی مماثلتیں محض نفسی ساخت کے اتفاقیہ طور سے یکساں ہونے کی وجہ سے ظہور پا سکتی ہیں، کیونکہ زماں و مکاں کا فصل اور ادبی روایات کی بے تعلقی، باہمی استفادہ و افادہ کے راستے میں حارج ہے۔''[۲]

یہاں ایک طرف تو مکانی بُعد واقع تھا،اورغالبؔ کے زمانے میں یورپین افکارکو ہندوستان تک پہنچتے کافی عرصہ لگ گیا۔دوسری بات یہ کہ کرکیگارڈ نے صرف داخلیت کی سچائی کی بات کی، جبکہ وجودیت کے فلسفے کو بہت بعد میں سارتر نے وضاحت کے ساتھ ایک مکمل تحریک کی صورت میں پیش کیا، جو کہ غالبؔ کے بہت عرصہ بعد آتے ہیں۔وجودیت کے بارے میں قاضی جاوید یوں رقمطراز ہیں:

''وجودیت ایک نیا مذہب ہے جودیگر مذاہب کی مانند اس وقت ظہور ہوا ہے جب کہ پہلے سے موجود مذاہب ،جن میں عقل پرستی اور سائنس پرستی بھی شامل ہیں ،جنھیں انیسویں صدی میں مقبول عقائد کا مرتبہ حاصل تھا ،انسانی روحوں کوتسکین دینے اور ان کے لیے بہتر طرزِ زندگی کاتعین کرنے میں ناکام ہو گئے۔''[۳]

اُردو میں لفظ''وجودیت'' کی اصطلاح(Existantialism)کے مترادف سمجھی جاتی ہے اور یہ اصطلاح سب سے پہلے کیتھولک فلسفی گیب رل مارسل(۱۸۸۹ء) نے استعمال کی۔بعد میں یہی اصطلاح اُن تمام فلاسفہ نے استعمال کی،جنھوں نے فلسفہ ٔوجودیت کے بارے میں اپنے خیالات کااظہار کیا۔بیسویں صدی میں وجودیت کے جوچارممتاز ترین نمائندے مانے گئے، وہ ہائیڈیگر، گیب رل مارسل، کارل یسپر(۱۹۶۹ء۔۱۸۸۳ء)اورژاں پال سارتر تھے۔ان میں دوفلسفی گیب رل مارسل اور کارل یسپر عیسائی وجودی تھے، جبکہ باقی دوفلسفی ہائیڈیگراورسارترملحد وجودی۔ان چاروں فلسفیوں کے مذہبی عقائد کی وجہ سے وجودیت کی دوقسمیں ہوگئیں۔(۱) عیسائی یامذہبی وجودیت (۲) ملحدانہ وجودیت۔چونکہ ان چاروں میں بھی سب سے زیادہ اثر سارتر کا رہا،اس لیے دُنیامیں ملحدانہ وجودیت زیادہ متعارف اورمقبول رہی۔

بیسویں صدی میں حالات کی خرابی ،انتشار،عدم استحکام اور معاشی بحران نے انسان کوجس داخلیت کی طرف متوجہ کیا سارتر نے اسے وجودیت کے فلسفے سے تعبیرکیا۔اس حوالے سے دیکھا جائے تو ہندوستان میں سلطنتِ مغلیہ کے زوال اور مرزا غالبؔ کے دوراور یورپ میں سارتر کے دور میں خاصی مماثلت نظرآتی ہے۔سارتر کے زمانے میں فرانس پرانی اقدار، روایات اور رواج میں جکڑا ہوا تھا،نیز معاشی اور اقتصادی حوالے سے بھی انتشار کا شکار تھا۔فرانس اور ہندوستان دونوں میں معاشرتی زوال اور دورِانحطاط میں فرد کی داخلیت اورعرفانِ ذات وقت کی سب سے بڑی قوتیں بن گئے۔۱۸۵۷ء کی ناکام جنگِ آزادی، انگریزوں کا تشدد، دورِغلامی، بہتر سیاسی نظام کا فقدان، عدم تحفظ کا احساس، سیاسی، معاشرتی اور معاشی حالات کی خرابی یہ سب وہ حالات تھے جنھوں نے فرد کو داخلیت کی طرف متوجہ کیا۔دیگرطبقوں کے ساتھ ساتھ ہندوستانی شعروادب پربھی اس کے اثرات پڑے۔ ہندوستان کے عہدِ انحطاط کے شاعر غالبؔ نے اپنی آنکھوں سے اپنی حکومت ،اپنی تہذیب، اور اپنے اہلِ علم اور اُن کے فضل وکمال کو بے دردی سے تاراج ہوتے دیکھا۔ایک خط میں دلی کی بربادی کے بارے میں لکھتے ہیں:'' چاہ بےآب ہے، ابر بے باراں ہے،نخل بےمیوہ ہے، خانہ بے چراغ ہے، چراغ بےنور ہے۔''[۴]

یہ فطری امر ہے کہ جب دومعاشروں کے حالات یکساں ہوجاتے ہیں تو وہاں انسانی سوچ کی پرواز میں بھی یکسانیت پیدا ہوجاتی ہے۔یورپ میں جن حالات کے باعث سارترانسان کے داخل کی طرف متوجہ ہوئے اوروجودیت کےعلمبردار بنے، اس سے کہیں پہلے ہندوستان کی سرزمین پراسداللہ خاں غالبؔ اس قسم کے حالات سے دوچار ہوکر پکار اُٹھے:

نام کا میرے ہے جو دکھ کہ کسی کو نہ ملا
کام میں میرے ہے جو فتنہ کہ برپا نہ ہوا ۵؎

وجودیت عمل اور تحرک پر زور دیتی ہے اور ہر قسم کے حالات میں انسان کو جینے کا قرینہ سکھاتی ہے۔سارتر زندگی کی قدر و قیمت کو بہت اہمیت دیتے ہیں اور موت سے پہلے محنت اور عمل کی ضرورت پر بہت زور دیتے ہیں۔ سارتر کے مطابق:''وہ چیز جو اسے (انسان) کو زندگی بخشتی ہے عمل ہے۔''۶؎ تمام وجودی جس بنیادی نظریے پر متفق ہیں اور سارتر جس کے سب سے بڑے علمبردار ہیں وہ یہ کہ وجود جوہر پر مقدم ہے۔یعنی انسان کا وجود پہلے اس دُنیا میں وارد ہوتا ہے اور بعد میں وہ خود کو کسی صورت میں ڈھالنے کا فیصلہ کرتا ہے جو کہ اس کا جوہر کہلاتا ہے۔اس طرح وجود پہلے اور جوہر بعد میں آتا ہے۔اپنے تمام اعمال کا ذمہ دار انسان خود ہے۔ اچھے یا برے عمل کی ذمہ داری اس کی ذات پر ہے۔اس فلسفے کے مطابق انسان اپنی تقدیر خود بناتا ہے۔ سارتر کہتے ہیں:''ہم انسان کو یاد دلاتے ہیں کہ اس کے سوا کوئی قانون ساز نہیں۔''۷؎ سارتر ملحد وجودی ہیں اور ان کے نزدیک انسان کی تخلیق اور اس کی تقدیر کا فیصلہ کرنے کے لیے کوئی خدا نہیں ہے۔ ان کے مطابق:''کیونکہ خدا ہی کوئی نہیں جو انسان کے تصور کی پیش بینی کر سکے۔''۸؎ اور ان کے مطابق اگر انسان کے مصائب اور مشکلات کا حل نکالنے کے لیے کوئی خدا نہیں ہے تو یہ تمام کام اس کو خود کرنے پڑیں گے۔ ان کے نزدیک زندگی صرف اعمال کا نتیجہ ہے۔غم یا خوشی ،جنت یا جہنم اور خدا کی ذات ان کے نزدیک بے معنی ہے۔ زندگی صرف یہی ہے موت کے بعد کچھ نہیں۔سارتر کے نزدیک جب حالات کی ابتری کی وجہ سے انسان دُکھوں اور مصائب کا شکار ہو جائے تو حالات کے سامنے ہتھیار ڈالنے کی بجائے اپنی اندرونی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر حالات کا سامنا کرے ،ورنہ مایوسی اور ناامیدی اس کا مقدر ہے ۔اس لیے مایوسی اور ناامیدی سے بہتر ہے کہ انسان اپنی چھپی ہوئی صلاحیتوں کا مظاہرہ کر کے زندگی کے تلخ لمحات کو راحت اور سکون میں بدل ڈالے۔

سارتر کے فلسفے کو سامنے رکھتے ہوئے جب غالبؔ کی حیات و افکار کا تجزیہ کیا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ جو نکات سارتر نے فلسفہ وجودیت کے حوالے سے بیان کیے ہیں،ان میں سے بیشتر فلسفۂ غالبؔ میں موجود ہیں ۔سارتر کے مطابق انسان خدا کے نہ ہونے اور حالات کی ابتری کی وجہ سے جب خود کو عدم تحفظ کا شکار پاتا ہے تو تنہائی اس کو گھیر لیتی ہے اور وہ مایوسی، ناامیدی، مستقبل کی فکر اور مستقبل کے حوالے سے درست فیصلہ کے بارے میں کرب اور موت کے خوف میں مبتلا ہو جاتا ہے لیکن یہ مایوسی ،ناامیدی اور موت کا خوف منفی نہیں ، بلکہ مثبت قوتیں ہیں،کیونکہ جب وہ تنہائی کا شکار ہوگا تو دوسروں پر بھروسہ کرنے کی بجائے اپنی ذات پر اعتماد کر کے تنہا حالات کا مقابلہ کرے گا۔ سارتر کے مطابق مایوسیاں اور ناامیدیاں انسان کو نئے سرے سے جدوجہد کرنے پر آمادہ کرتی ہیں ۔کرب اور اضطراب اس کو مستقبل کے بارے میں درست فیصلہ کرنے کی ہمت عطا کرتے ہیں اور موت کا خوف اسے عمل کے راستے پر گامزن کر دیتا ہے۔اس حوالے سے دیکھا جائے تو جو باتیں سارتر نے وجودیت کی تحریک کے لیے ایک مکمل اور باضابطہ لائحہ عمل کے طور پر بیان کی ہیں ،غالبؔ کے ہاں بکھری ہوئی خام صورت میں دیکھنے کو مل جاتی ہیں اور انھی منفی قوتوں کو خود غالبؔ نے اپنے افکار میں مثبت قوتوں میں تبدیل کرنے کی نہ صرف بھرپور کوشش کی ہے ، بلکہ اپنی زندگی میں اس کا عملی مظاہرہ بھی کیا ہے۔

غالبؔ اور سارتر کے فلسفے کی مماثلتیں تلاش کرنے سے پہلے وجودی فلسفے کا ایک خاکہ مرتب کر دینا مناسب ہوگا ،جس

کو ذہن میں رکھ کر اسے غالبؔ کے فکر و فلسفے سے ملانے کی کوشش بارآور ثابت ہو سکتی ہے۔ سارتر نے جن مباحث کو چھیڑا ہے، ان کا اجمال کچھ یوں ہے:

۱۔ وجودیت سکونِ قلب کی تلاش اور عمل کا فلسفہ ہے۔

۲۔ انسان کی تقدیر بنانے کے لیے کوئی خدا نہیں ہے۔

۳۔ انسان نے خود کو تخلیق نہیں کیا، اس لیے وہ آزاد ہے۔ وہ جس طرح چاہے زندگی بسر کرے۔

۴۔ وجود بنیادی طور پر منفرد ہے۔ وہ کسی سے مماثل نہیں۔

۵۔ وجود آگہی اور عرفانِ ذات کا سرچشمہ ہے۔ انسان کی ذات سے بالا کوئی ذات نہیں۔

۶۔ جماعت میں فرد کی انفرادی صلاحتیں ختم ہو جاتی ہیں، اس لیے فرد کو اجتماع اور تقلید سے گریز کرنا چاہیے۔

۷۔ انسان کو طاقت کا سرچشمہ بن کر کسی بیرونی سہارے کی محتاجی کے بغیر تنہا ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کرنا چاہیے۔

۸۔ انسان کا مستقبل کے بارے میں ہر فیصلہ صرف اس کی ذات کے لیے نہیں، بلکہ تمام بنی نوع انسانی کی فلاح و بہبود کے لیے ہونا چاہیے۔

۹۔ کرب، بے کسی اور اکتاہٹ وقتی اور مثبت چیزیں ہیں، کیونکہ یہ انسان کو مستقبل کے فیصلے اور عمل کی ہمت عطا کرتی ہیں۔

۱۰۔ مایوسی اور ناامیدی منفی نہیں، بلکہ مثبت قوتیں ہیں، کیونکہ یہ انسان کو نئے سرے سے عمل کرنے پر آمادہ کرتی ہیں۔

۱۱۔ انسان کو کسی اُمید اور صلے کی پرواہ کیے بغیر عمل کے لیے کوشاں ہونا چاہیے۔

۱۲۔ تنہائی کا احساس وجود کی تکمیل کے لیے ضروری ہے، کیونکہ تنہائی میں مسائل کو سلجھانے اور مستقبل کی منصوبہ بندی کا موقع ملتا ہے۔

۱۳۔ موت کے خوف کا علاج یہ ہے کہ اسے وجود کی تکمیل کا لازمی حصہ تسلیم کیا جائے۔

۱۴۔ موت کا خوف مثبت قوت ہے، کیونکہ اس طرح زندگی کو غنیمت سمجھ کر اس سے زیادہ حظ اُٹھانے کا احساس پیدا ہوتا ہے۔

۱۵۔ زندگی کے اختصار کو مدِ نظر رکھ کر سخت محنت اور عمل کر کے موت سے پہلے تمام کام پایۂ تکمیل تک پہنچانے چاہیے۔

مندرجہ بالا تمام باتوں کی روشنی میں اب سارتر اور غالبؔ کی مماثلتوں کو ڈھونڈنے کی کوشش کی جائے گی تا کہ معلوم ہو جائے کہ سارتر نے وجودی فلسفے میں جو باتیں بتائی ہیں، وہ کہاں تک غالبؔ کے افکار میں موجود ہیں اور کہاں تک ان دونوں میں مماثلت پائی جاتی ہے۔

سارتر کا فلسفہ وجودیت داخلیت، عمل اور سکونِ قلب کا فلسفہ ہے۔ یہ بتایا جا چکا ہے کہ جب بیسویں صدی میں تمام روایتی فلسفے انسان کی روح کو تسکین فراہم کرنے میں ناکام ہو گئے، تو وہ روحانی سکون کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ سارتر بھی اپنے زمانے کے مروجہ قوتوں کو انسانی مسائل کو حل کرنے میں ناکام پا کر سکون کی تلاش میں نکلتے ہیں، اور وجودیت کا فلسفہ پیش کر کے انسان کو سکونِ قلب کی طرف مائل کرتے ہیں۔ اِدھر غالبؔ سارتر سے بہت پہلے ہندوستان میں ویسے ہی حالات کا سامنا کرتے

ہیں۔سارتر فلسفۂ وجودیت کے حوالے سے سکونِ قلب کے لیے جس سفر کی بات بیسویں صدی میں کرتے ہیں، غالبؔ ان سے پہلے انیسویں صدی میں اس سفر پر روانہ ہو چکے تھے۔اس حوالے سے غالبؔ کہتے ہیں:

> ''زیست بسر کرنے کو کچھ تھوڑی سی راحت درکار ہے اور باقی حکمت اور سلطنت اور شاعری ساحری، سب خرافات ہیں۔''۹

غالبؔ مصائب و آلام میں اس طرح گرفتار ہیں کہ جبر اور اختیار دونوں صورتوں میں راحت سے عاری ہیں۔جبھی تو سارتر کی طرح سکون اور راحت کی تلاش میں سرگرداں پھرتے ہیں۔ کہتے ہیں:

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو ۱۰

سارتر ملحد اور خدا کے وجود سے انکاری ہیں۔ان کے مطابق: ''خدا کا کوئی وجود نہیں اور نہ ہی کوئی ایسا متقدم سانچہ ہی ہے جو دُنیا اور اس کے تمام امکانات کو میری مرضی کے مطابق ڈھال سکے۔''۱۱

غالبؔ کا تصورِ خدا کیا ہے؟ ان کے یہاں خدا کی حقیقت کے متعلق دو رویے ہیں۔پہلا وحدت الوجود کا عقیدہ کہ انسان کا وجود خدا کے وجود سے الگ کوئی شے نہیں۔انسان کا وجود خدا تعالیٰ کے وجود کا حصّہ ہے۔اپنے الگ وجود کا احساس وہم کا نتیجہ ہے، ورنہ ہم خدا کی ہستی کو اپنی ذات سے الگ نہیں کر سکتے، اور یہی عقیدہ مذہبی وجودیوں کا بھی ہے۔غالبؔ کہتے ہیں:

از وہم قطرگیست کہ در خود گمیم ما
اما چو وا رسیم ہمان قلزمیم ما ۱۲

> ترجمہ: ''یہ ہمارا وہم ہے کہ ہم قطرہ ہیں، جو ہم خود میں گم ہیں، لیکن جب غور کرتے ہیں تو ہم وہی سمندر ہیں۔''

غالبؔ کا یہ عقیدہ اپنی جگہ درست سہی لیکن ڈاکٹر سید عبداللہ کہتے ہیں:

> ''یہ عام صوفیانہ نقطہ نظر ہے جس سے انسان کی کلی عظمت کا تصور پیدا ہوتا ہے، لیکن یہ سب کچھ علمی نظری، خیالی یا نصب العینی ہے۔اس سے ذہنی تسکین تو ہو سکتی ہے، لیکن جذبات کی دُنیا الگ ہے اور اس کی کیفیت جدا ہے۔''۱۳

غالبؔ جب جذبات کی نظر سے اس عالمِ رنگ و بو کو دیکھتے ہیں، تو کچھ اور صورتِ حال سے دوچار ہوتے ہیں۔غالبؔ خدا کی ذات کو واحد اور سب کچھ ماننے کے باوجود انفرادی احساس کی روشنی میں جب دیکھتے ہیں تو اس کے اظہار میں تشکیک کی صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں اور وہ خدا کی اُن صفات کے بارے میں بھی شک کرنے لگتے ہیں جو عام طور پر ہر کسی کے لیے تسلیم شدہ ہیں۔ان کے ہاں یہ شکایتیں مختلف صورتیں اختیار کرتی ہیں۔مثلاً گردشِ دہر، خدا، فطرت یا قانون، فلک جو بھی اس نظام عالم کو چلا رہا ہے اس کے بارے میں ان کا نظریہ شکایتی ہے۔اور اس کی وجہ بھی وہ مصائب ہیں جو غالبؔ کی زندگی میں پے بہ پے

رونما ہوئے۔ یہ حقیقت ہے کہ جب انسان کا کسی خدائے واحد پر اعتماد ختم ہو جاتا ہے تو ایسے ہی گلے شکوے کرنے لگتا ہے۔ غالبؔ ایک جگہ جبر کے حوالے سے کہتے ہیں:

ای سبزہ سر رہ از جور پا چہ نالی
درکیش روزگاراں گل خوں بہا ندارد ۱۴؎

ترجمہ: ''اے راستے میں اُگنے والے سبزے تو پاؤں کے ظلم کے خلاف کیوں فریاد کرتا ہے، دُنیا کے قانون میں پھول کا کوئی خوں بہا نہیں ہے۔''

یہ وہ مقام ہے جب سارتر کے نزدیک کسی ایک خدا کے نہ ہونے سے انسان تنہائی، نامرادی، بے کسی، غم و افسردگی کے اندھے غار میں دھکیل دیا جاتا ہے۔ غالبؔ اُمنگوں بھرا دل لائے تھے لیکن زندگی میں ایسے واقعات سے دوچار ہونا پڑا کہ سارے نشے اُتر گئے اور خوداعتمادی کی جگہ تردد اور تشکک نے لے لی۔ خدا کی ذات پر سے اُن کا اعتماد اُٹھنے لگا۔ اس مقام پر سارتر کی طرح غالبؔ بھی تشکک میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور سوچنے لگتے ہیں کہ اس دنیا سے ماورا کوئی حقیقت نہیں۔ کوئی جنت نہیں۔ اُنھوں نے جنت کا تذکرہ ہمیشہ مضحکہ خیز انداز میں ہی کیا ہے:

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے ۱۵؎
زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے! ۱۶؎

خطوطِ غالبؔ میں بھی کہیں کہیں ایسے بیانات موجود ہیں جن میں بہشت اور خدا کی حقیقت کے حوالے سے مضحکہ خیز انداز اپنایا گیا ہے۔ ایک خط میں وہ لکھتے ہیں:

''میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہو گئی اور ایک قصر ملا، اور ایک حور ملی۔ اقامت جاودانی ہے اور اسی ایک نیک بخت کے ساتھ زندگانی ہے۔ اس تصور سے جی گھبراتا ہے ہے وہ حور اجیرن ہو جائے گی۔ طبیعت کیوں نہ گھبرائے گی؟ وہی زمردیں کاخ اور وہی طوبیٰ کی ایک شاخ! چشم بد دور، وہی ایک حور۔ بھائی ہوش میں آؤ۔'' ۱۷؎

یہاں غالبؔ کو سارتر کی طرح ملحد ثابت کرنا نہیں، بلکہ اس حوالے سے دونوں میں جو مماثلت ہے اس کو سامنے لانا ہے۔ اگرچہ غالبؔ بھی کبھی کبھی خدا کے وجود کے بارے میں متشکک ہو کر مایوس ہو جاتے ہیں، لیکن سارتر پکا ملحد، جبکہ غالبؔ مسلمان اور خدا کی وحدانیت کو تسلیم کرتے ہیں۔ غالبؔ سارتر کی طرح خدا کے وجود کے بارے میں انتہا پسندانہ سوچ نہیں رکھتے۔ ایک طرف وہ اپنے ذاتی حالات سے مجبور ہو کر اگر مذہبی عقائد کا مذاق اُڑانے پر مجبور ہو جاتے ہیں تو دوسری جانب ان کے ہاں خدا اور مذہب سے انسیّت اور محبت کا جذبہ بھی نمایاں ہے۔ غالبؔ خدا کو مانتے ہیں، لیکن حالات کی تنگی اور ابتری کی وجہ سے کبھی کبھی شکایت کرتے ہیں کہ واقعی کوئی خدا ہے؟ یعنی واقعی اگر کوئی خدا ہوتا تو ہماری حالت اتنی ناگفتہ بہ نہ ہوتی۔ گویا یہاں وہ مسلمان ہوتے ہوئے بھی ملحدانہ اوصاف اپنا لیتے ہیں۔

خدا کے وجود سے انکار کے بعد سارتر انسان کی پیدائش کی بات کرتے ہیں ۔ ان کے خیال میں انسان کی تخلیق اس کے بس میں نہیں ہے۔انسان کو اس عالمِ رنگ و بو میں پھینک دیا گیا ہے۔اس کو پیدا کرنے کے لیے کوئی خدا نہیں ہے۔ جب خدا نہیں ہے تو انسان ہر طرح سے آزاد ہے ۔وہ جس طرح چاہے زندگی بسر کرے ۔ان کے بقول: ''ہمیں تنہا چھوڑ دیا گیا ہے، بغیر کسی عذر کے۔''۱۸ ان کے مطابق انسان کو آزاد رہنے کی سزا ملی ہے ۔یعنی اگر انسان کی پیدائش اور اس کی تقدیر بنانے کے لیے کوئی خدا نہیں ہے تو وہ اپنی تقدیر خود بنائے گا،اور اس کا اپنے لیے تقدیر بنانا ہی اس کی سب سے بڑی سزا ہے۔اب وہ اپنے ہر فیصلے ،عمل اور انتخاب میں بالکل آزاد ہے ۔ ہر وہ واقعہ جو اس کے ساتھ پیش آتا ہے ، اُس کا اپنا پیدا کردہ ہے۔اس میں کسی حادثے یا اتفاق کو دخل نہیں ہے ۔ وجودی یہ سمجھتے ہیں کہ جب انسان کو اس جہان میں پھینکا گیا تو اس پر اسے کوئی اختیار نہیں تھا،لیکن جوں ہی یہ عمل ختم ہوا وہ خود مختار اور آزاد ہو گیا۔ بقول سارتر:''جب سے وہ (انسان) کو اس دُنیا میں پھینک دیا گیا ہے، اپنے ہر عمل کا خود ذمہ دار ہے۔''۱۹

سارتر کی طرح غالب کے یہاں بھی بنیادی مسئلہ انسان کی پیدائش کا ہے ۔دونوں کے نزدیک انسان کی پیدائش ہی اس کے لیے مصیبت کا باعث ہے ۔سارتر کی طرح غالبؔ بھی اپنی پیدائش کے سامنے بے بس ہیں ۔ان کے مطابق انسان کو اپنی پیدائش پر کوئی اختیار نہیں ۔ کہتے ہیں :ع

ڈبویا مجھ کو ہونے نے ، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا ۲۰

غالبؔ بھی وجودیوں کی طرح انسانی زندگی کو سزا سمجھتے ہیں۔ان کے نزدیک انسان کو اس دنیا میں صرف اور صرف آہ و زاری اور روبکاری کے لیے بھیجا گیا ہے۔

نالے عدم میں چند ہمارے سپرد تھے
جو واں نہ کھنچ سکے ، سو وہ یاں آ کے دم ہوئے ۲۱

اپنے ایک دوست کو خط میں لکھتے ہیں:

''عالمِ ارواح کے گنہ گار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں ۔چنانچہ میں آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ میں روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا۔''۲۲

غالبؔ بھی زندگی کو آزار سمجھ کر خود کو ہر طرح کی اخلاقی و مذہبی قیود سے نہ صرف آزاد سمجھتے ہیں ، بلکہ ان کی زندگی اس کا عملی نمونہ ہے ۔ وہ سارتر کی طرح من پسند حیاتِ انسانی کے قائل ہیں۔ لکھتے ہیں :''نہ شکر ہے ، نہ شکایت ہے ۔جو تقریر ہے ، بہ سبیل حکایت ہے ۔بارے جہاں رہو ، جس طرح رہو۔'' ۲۳ ایک اور خط میں لکھتے ہیں:''ابتدائے شباب میں ایک مرشد کامل نے ہم کو یہ نصیحت کی کہ ہم کو زہد و ورع منظور نہیں ۔ہم مانع فسق و فجور نہیں ۔پیو، کھاؤ ،مزے اُڑاؤ۔''۲۴ مزید کہتے ہیں :

یہ لاشِ بے کفن اسدِ خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا ۲۵

اپنی آزادہ روطبیعت کی بدولت عاصیوں کے کوچے میں بھی آزادی کے ساتھ چکر لگاتے ہیں۔ثوابِ طاعت و زہد جانتے ہوئے بھی عاصیوں کی فہرست میں نام لکھوانے پر فخر کرتے ہیں:

اہلِ ورع کے حلقہ میں ہر چند ہوں ذلیل
پر عاصیوں کے فرقہ میں ، میں برگزیدہ ہوں ۲۶

غالبؔ بندگی میں بھی آزادہ روی کے قائل ہیں اور اپنی مرضی کی بندگی اختیار کرتے ہیں:۔

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم
اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا ۲۷

سارتر کے ہاں وجود کی ایک بنیادی خصوصیت فردِ موجود کا منفرد ہونا ہے۔اس کی انفرادیت اس کی ''میں'' میں پنہاں ہے۔وہ اپنے ہونے کے حوالے سے کسی بھی دوسرے سے مماثل نہیں۔وہ منفرد ہے، نہ کسی سے مدد مانگتا ہے، نہ کسی پر بھروسا کرتا ہے اور نہ کسی کا محتاج ہے اوراسی بنا پر انا پرست اور خوددار بھی ہے،اور یہ خصوصیت غالبؔ میں بدرجہ اتم موجود ہے۔وہ بھی خود کو دوسروں سے منفرد سمجھتے ہیں ۔کہتے ہیں:۔

ہیں اور بھی دُنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور ۲۸

سارتر کے نزدیک وجود نہ صرف خودآ گاہ ہوتا ہے بلکہ آ گہی اورعرفانِ ذات کا سرچشمہ بھی ہوتا ہے۔سارتر عمل کے ساتھ ساتھ احساسِ ذات اور خودی کو بھی اہمیت دیتے ہیں۔ان کے مطابق انسان کی ذات سے بالا کوئی ذات نہیں۔سارتر کی طرح غالبؔ بھی انسانیت کی عظمت کے قائل ہیں ۔ان کے نزدیک انسان اپنی ذات وصفات میں منفرد ہے اور رتبے میں مہر و ماہ سے کسی طرح بھی کم نہیں ۔کہتے ہیں:۔

رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں سے کیوں دریغ
رتبے میں مہر و ماہ سے کم تر نہیں ہوں میں ۲۹

غالبؔ کے نزدیک انسانی وجود کے بغیر زندگی کے ہنگامے سرد ہیں۔انسان اپنے اندر خدائی صفات رکھتا ہے۔ وہ زندگی کی یک رنگی کو رنگا رنگی بخش کر فطرت کی حنا بندی کرتا ہے،اورخس وخاشاکِ گلستاں کو روشنی اور تازگی بخشا ہے۔کہتے ہیں:۔

نگہِ گرم سے اک آگ ٹپکتی ہے اسدؔ
ہے چراغاں خس و خاشاکِ گلستاں مجھ سے ۳۰

ان کے نزدیک اس حیات وکائنات کو شرف وجودِ انسانی ہی کی بدولت حاصل ہے۔کہتے ہیں:۔

ہر اک مکان کو ہے مکیں سے شرف ، اسدؔ!
مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے ۳۱

وہ انسان کو ترقی کرتا ہوا اور آگے بڑھتا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں ۔ان کو جب اپنے ماحول میں انسان کی زندگی باعثِ تذلیل دکھائی دیتی ہے تو ان کو انسانیت کی اس قدر تذلیل اور زبوں حالی سے بڑی تکلیف ہوتی ہے اور صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں۳۲

وجودیت کا مقصد یہ ہے کہ انسان کو اپنے ہونے کا احساس دلایا جائے۔ انسان یہ سوچنے پر مجبور ہو جائے کہ اس کا وجود، اس کی زندگی بے کار نہیں، بلکہ اس کے سامنے کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہے۔ اپنے ہونے کا احساس ہی اسے عرفانِ ذات کی طرف لے جاتا ہے، اور بقول غالبؔ:

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود
قبلے کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں۳۳

غالبؔ اپنی ذات کے مقابلے میں دنیا کی باقی چیزوں کو ہیچ سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک انسان کی عظمت کے آگے ''اورنگِ سلیماں'' اک کھیل اور ''اعجازِ مسیحاؔ'' صرف اک بات ہے۔ اس حوالے سے وہ مزید کہتے ہیں:

ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے
گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے۳۴

وجودیت انفرادیت کا فلسفہ ہے۔ وجودی ہر انسان کے انفرادی وجود کو اہمیت دیتے ہیں۔ یہاں ہر حوالے سے انسان کی انفرادی صلاحیتوں کو اُجاگر کرنا مقصود ہے۔ سارتر کے مطابق گروہ یا جماعت میں فرد کی انفرادی صلاحیتیں ختم ہو جاتی ہیں، اس لیے ایک فرد کو اجتماع سے گریز کرنا چاہیے اور انفرادی طور پر عمل پیرا ہو کر اپنی تقدیر کا خالق بننا چاہیے۔ بقول عرش صدیقی:

> ''وجودی ہر انسان کے انفرادی وجود کو اہم ترین شے تصور کرتا ہے اور پوری نوعِ انسانی کو بحیثیتِ مجموعی اس لیے قابلِ غور نہیں سمجھتا کہ ہر شخص دوسرے سے مختلف ہے اور گروہ یا جماعت فرد کی اپنی حیثیت کو ختم کر دیتا ہے اور نہ صرف اس کی آزادی سلب کر لیتا ہے، بلکہ اُسے ہر طرح کی ذمہ داری سے آزاد کر دیتا ہے۔''۳۵

غالبؔ بھی اپنی انفرادی صلاحیتوں پر اعتماد کرتے ہوئے عمل کے راستے پر گامزن ہوتے ہیں اور دوسروں کی تقلید پر بھروسہ نہیں رکھتے۔ یہاں سارتر کی طرح غالبؔ کا پیغام بھی یہی ہے کہ اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے۔ کہتے ہیں:

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
جانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے۳۶
قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیِ منصور نہیں۳۷

سارتر کی طرح غالبؔ بھی کسی بیرونی سہارے پر اعتماد کرنا پسند نہیں کرتے اور اپنے بل بوتے پر مختلف مسائل کا حل نکالنا پسند کرتے ہیں۔ ان کے مطابق اپنی ذات سے باہر کسی خارجی قوت سے مدد مانگنا خودی کی موت کے مترادف ہے۔ ان کے خیال میں جو کچھ ملتا ہے، اپنی ہی کوشش سے ملتا ہے، اس لیے کسی بیرونی سہارے سے توقع رکھنا محال ہے۔

گر تجھ کو ہے یقینِ اجابت دُعا نہ مانگ
یعنی بغیرِ یک دلِ بے مدعا نہ مانگ[۳۸]

غالبؔ کے زمانے میں جب روایتی مذہب کے خلاف شاہ اسمٰعیل نے جہاد شروع کیا تو غالبؔ نے اس کی بھر پور حمایت کی ۔شاہ اسمٰعیل اور غالبؔ دونوں کا مسلک اور مقصد ایک تھا ،یعنی تقلید کے خلاف جہاد۔اس لیے دوسرے حوالوں کے ساتھ ساتھ اس حوالے سے بھی غالبؔ ایک غیر مقلد کی صورت میں سامنے آتے ہیں۔

سارتر کے مطابق انسان کے اندر بہت سی قوتیں جمع ہیں جن کو بروئے کار لا کر انسان ہر قسم کے حالات میں زندگی جی سکتا ہے ۔انھوں نے انسان کو طاقت کا سرچشمہ قرار دے کر اسے اپنی ذات پر اعتماد کرنا سکھایا۔اس قوت کی بدولت سارتر نے انسان کو زندگی کی کٹھن اور مشکل راہوں پر چلنے کی تدبیر بتائی ۔ان کے مطابق :''وجودیت کا پہلا اثر یہ ہے کہ یہ انسان کو ،جیسا کہ وہ ہے ،اپنے اوپر قدرت عطا کرتی ہے۔''[۳۹]

غالبؔ کی ذات میں بھی یہ قوت موجود ہے جس کے ذریعے وہ اپنے غموں کو ہلکا کر دیتے ہیں۔سارتر اور غالبؔ کے نزدیک غم انسان کے وجود کو جھنجھوڑتا ہے ۔اور بقول غالبؔ:''حسین مرزا کی داڑھی سفید ہوگئی !یہ شدتِ رنج وغم کی خوبیاں ہیں۔''[۴۰] سارتر کے مطابق تکالیف انسان کے اندر سے پیدا ہوتی ہیں اور خود پر اعتماد کر کے ہی انسان ان سے نجات پا سکتا ہے۔ان کے خیال میں انسان کو چارہ سازوں کا محتاج نہیں ہونا چاہیے ،بلکہ ہر قسم کی مصیبت کا مقابلہ اسے خود کرنا چاہیے ۔غالبؔ بھی اس معاملے میں احباب کی چارہ سازی سے مطمئن نہیں ہیں۔کہتے ہیں؎

احباب چارہ سازئ وحشت نہ کر سکے
زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا[۴۱]

سارتر کے نزدیک کسی گروہ یا جماعت سے امید رکھنا عبث ہے۔دوسرے کسی کے لیے کچھ نہیں کر سکتے ،کیونکہ وہ اپنے مسائل میں ڈوبے رہتے ہیں ۔غالبؔ کا بھی جب سارتر کی طرح چارہ سازوں پر سے بھروسا اُٹھ جاتا ہے تو ان سے توقعات وابستہ کرنا چھوڑ دیتے ہیں ۔کہتے ہیں؎

جب توقع ہی اُٹھ گئی غالبؔ
کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی[۴۲]

انسانوں سے توقع رکھنا تو عام سی بات ہے ،غالبؔ تو کبھی کبھی خدا سے بھی توقعات وابستہ کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔ایک خط میں لکھتے ہیں:''یہاں خدا سے بھی توقع باقی نہیں ،مخلوق کا کیا ذکر؟۔''[۴۳] لیکن سارتر کی طرح غالبؔ بھی مصائب اور تکالیف سے فرار اختیار نہیں کرتے ، بلکہ تنِ تنہا ان تمام تکالیف کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہیں۔کہتے ہیں:''اگر خدانخواستہ باشد غم دنیا ہے تو بھائی ہمارے ہم درد ہو۔ہم اس بوجھ کو مردانہ وار اٹھا رہے ہیں۔''[۴۴] اور بقول ناصر کاظمی:

''غالبؔ کو زندگی بھر مصائب و آلام کا سامنا کرنا پڑا۔۔۔اور ہر بیدادِ زمانہ کو حیاتِ تازہ کی دلیل سمجھ کر اس کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔''[۴۵]

غالبؔ اپنے اندر ایسا جذبہ پیدا کرتے ہیں جس کی وجہ سے تکالیف خود بخود دور ہو جاتی ہیں ۔ان کے مطابق انسان کو صحیح

معنوں میں انسان بننے کے لیے دشوار گزار مراحل سے گزرنا پڑتا ہے، کیونکہ زمانے کے نامساعد حالات کی بھٹی میں جل کر ہی آدمی کندن بنتا ہے۔ کہتے ہیں:

اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب
لطمۂ موج کم از سیلئ اُستاد نہیں۴۶

سارتر کے مطابق عمل اور بہتر انتخاب سے پہلے انسان کو مختلف مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ ان کے مطابق جب انسان پر کسی خدا کے نہ ہونے سے تنہائی کے عالم میں اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے تو وہ عجیب صورت حال سے دوچار ہوتا ہے، اور اس مقام پر وہ کرب، مایوسی، بے کسی، تنہائی، خوف اور بے بسی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس لیے وجودیت پر لوگوں نے کئی اعتراضات کیے ہیں کہ سارتر کا یہ فلسفہ انسان کو کرب، اضطراب، مایوسی، تنہائی اور موت کے خوف میں مبتلا کر کے ترقی سے روکتا ہے، اور خدا کے نہ ہونے سے انسان کو آزاد اور خود مختار بنا کر ہر برے فعل کی ترغیب دیتا ہے۔ لیکن سارتر نے ان تمام اعتراضات کے جامع انداز میں جوابات دیے ہیں اور ان منفی عناصر کو مثبت بنا کر پیش کیا ہے۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو غالبؔ بھی عملی زندگی میں ان مقاماتِ آہ وفغاں سے دوچار نظر آتے ہیں، لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ انھوں نے بھی سارتر کی طرح ان تمام منفی عناصر کو مثبت قوتوں میں تبدیل کیا ہے۔

یہ اعتراض کہ جب انسان کو اپنے بارے میں فیصلہ کرنے کا اختیار دیا جاتا ہے تو یہ لازمی امر ہے کہ وہ شر اور ہر قسم کی برائی کا ارتکاب بھی کر سکتا ہے۔ لیکن سارتر کہتے ہیں کہ چونکہ وہ یہ فیصلہ صرف اپنے بہتر مستقبل کے بارے میں کرے گا، لھٰذا وہ کبھی شر کا انتخاب نہیں کرے گا۔ علاوہ ازیں چونکہ اس کا یہ فیصلہ صرف اس کی ذات تک محدود نہیں، بلکہ تمام بنی نوع انسانوں کی فلاح سے تعلق رکھتا ہے، اس لیے جب فرد اپنے لیے نیکی کا انتخاب کرے گا تو یقیناً وہ دوسروں کے لیے بھی نیک ثابت ہوگا، کیونکہ ہر انسان اپنے لیے وہی چیز پسند کرتا ہے، جو تمام بنی نوع انسانی کے حق میں بہتر ہو۔ سارتر خود سے زیادہ انسانیت کی فلاح چاہتا ہے، اور یہی وجودیت کا اصل مقصد بھی ہے کہ انسان زیادہ سے زیادہ دوسروں کے کام آئے۔ یہاں سارتر انسان کو مکمل آزادی نہیں دیتا، بلکہ شر کے انتخاب سے روک کر وہ اسے نیکی کا پابند بناتا ہے۔ غالبؔ بھی آزاد پسند طبیعت کے مالک ہیں، لیکن یہاں وہ انسان کو ایک حد تک آزای کا اختیار دیتے ہیں، گویا سارتر کی طرح غالبؔ بھی آزادی کے اندر پابندی کے قائل نظر آتے ہیں۔ ایک خط میں لکھتے ہیں: ''مصری کی مکھی بنو، شہد کی مکھی نہ بنو''۴۷ مطلب یہ کہ شہد کی مکھی پھنس کر نکل نہیں سکتی۔ مصری کی مکھی جب چاہے آسانی سے اڑ جاتی ہے۔ یعنی زندگی میں اپنے لیے ایسے مسائل پیدا نہ کرو کہ اس میں اُلجھ کر رہ جاؤ۔ مزید کہتے ہیں ؎

روک لو گر غلط چلے کوئی
بخش دو گر خطا کرے کوئی۴۸

غالبؔ آزادہ رو ہیں، لیکن وہ وارستگی یعنی آزادہ روی کی اس صورت کو کبھی پسند نہیں کرتے جس میں آزادہ روی بے عملی اور جمود کی صورت اختیار کرے۔ سارتر کی طرح اُن کے مستقبل کا ہر فیصلہ انسانیت کی فلاح و بہبود سے متعلق ہے۔ کہتے ہیں۔ ؎

وارستگی　بہانۂ　بیگانگی　نہیں
اپنے سے کر نہ غیر سے وحشت ہی کیوں نہ ہو۴۹؎

اس حوالے سے شرر نعمانی لکھتے ہیں:

''وارستگی کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ اپنی خواہشات سے نجات حاصل کرو،لیکن دوسروں کے مفاد کے لیے ہمیشہ عمل پیرا رہو۔''۵۰؎

یہاں غالبؔ سارتر سے زیادہ انسانیت کے خیر خواہ نظر آتے ہیں ۔ سارتر پہلے خود اور بعد میں عام بنی نوع انسانی کا خیرخواہ ہے،جبکہ غالبؔ انسانیت کی فلاح و بہبود کو ذاتی مفاد پر ترجیح دیتے ہیں ۔

یہ اعتراض کہ وجودیت انسان کو کرب اور اضطراب میں مبتلا کر دیتی ہے، کے جواب میں سارتر کہتے ہیں کہ کرب داخلی کشمکش کا نام ہے۔کرب کا تصور سب سے پہلے کرکیگارڈ کے ہاں ملتا ہے۔زندگی میں ہر انسان کو بالخصوص حالات کی ابتری کی وجہ سے اپنے مستقبل کے بارے میں آزادانہ اوردرست فیصلہ کرنا پڑتا ہے جس پر اس کے مستقبل کا دارومدار ہوتا ہے۔سارتر کے نزدیک فیصلے کے اس مقام پر انسان اضطراب کی کیفیت میں مبتلا ہو جاتا ہے اور وہ سوچتا ہے کہ ان کا یہ فیصلہ درست بھی ثابت ہوگا کہ نہیں، کیونکہ یہ فیصلہ غلط بھی ہوسکتا ہے۔جس طرح اوپر بتایا جا چکا ہے کہ وجودیوں کے نزدیک فرد نہ صرف اپنے اعمال کے عواقب کا ذمہ دار ہے، بلکہ اس پر تمام نوعِ انسانی کی ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے ۔ذمہ داری کا یہی احساس اُس کو کرب سے دوچار کر دیتا ہے اوریہی کرب آدمی کو ذمہ داری کا احساس دے کر حالات کا مقابلہ کرنے کی ہمت عطا کرتا ہے۔سارتر کے نزدیک یہ نیستی کا کرب بھی ہوسکتا ہے اور مستقبل کے بارے میں درست فیصلے کا بھی، جو انسان کو کشمکش میں مبتلا کر دیتا ہے اور وہ کوئی فیصلہ کرتے وقت ہچکچاتا ہے۔

غالبؔ بھی زندگی میں بہت سے مقامات پر کرب اور اضطراب سے دوچار ہوتے ہیں۔وہ ابتدا ہی سے مختلف قسم کے مسائل سے دوچار ہوگئے تھے ۔بچپن میں والد کی وفات،پنشن کا مسئلہ، ناکام سفرِ کلکتہ،قید کی سزا اور سانحۂ غدر، یہ وہ سارے واقعات تھے،جن کی وجہ سے غالبؔ دوسرے مسائل کے ساتھ معاشی تنگی کا شکار ہوگئے اور ان کی عیش کوشی قصۂ پارینہ بن گئی ۔ان تمام حالات کی وجہ سے غالبؔ بھی وقتی افتادگی اور کرب کے شکار ہوکر زندگی کے مختلف مقامات پر مستقبل کے حوالے سے کوئی فیصلہ کرتے وقت کشمکش میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔کہتے ہیں؂

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رَو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں۵۱؎

سارتر جب ''بے کسی'' کی بات کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جب خداموجود نہیں ہے تو مصیبت کے وقت کسی ہستی کو پکارنے کی ضرورت باقی نہیں ،اور جب انسان کے پاس کسی سہارے کا جواز ڈھونڈنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی تو اس مقام پر وہ خود کو بے کس محسوس کرتا ہے۔غالبؔ بھی جب پے بہ پے سانحات کا سامنا کرتے ہیں تو اپنی بے کسی اور مجبوری کا اظہار کچھ اس طرح کرتے ہیں؂

بے دلی ہائے تماشا ، کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
بیکسی ہائے تمنا ، کہ نہ دنیا ہے ، نہ دیں۵۲
مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لیے۵۳

سارتر کے نزدیک بے کسی کے مقام پر انسان اکتاہٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس مرحلے پر فرد زندگی سے اکتا جاتا ہے۔ وہ زندگی کی یکسانیت میں تبدیلی کا خواہاں ہوتا ہے۔ اکتاہٹ کا تعلق فرد کے داخل سے ہے اور یہ کیفیت فرد کو تبدیلی کا احساس دلاتی ہے۔ بقول افتخار بیگ:

> ''اکتاہٹ کا یہ عمل کسی خارجی علت کا محتاج نہیں ہوتا بلکہ یہ فرد کی داخلی کیفیت ہے جو فرد کو مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنی زندگی کی ڈگر تبدیل کرے۔''۵۴

غالبؔ کے یہاں بھی اکتاہٹ کی بے شمار مثالیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ایک خط میں لکھتے ہیں: ''خود اس نمایش گاہ کی سیر سے، جس کو دُنیا کہتے ہیں، دل بھر گیا۔''۵۵ ہر انسان کی طرح اُن کی زندگی میں بھی ایسے موڑ آتے ہیں جہاں ان کے پاس کوئی ایسا راستہ باقی نہیں رہتا جہاں سے وہ تبدیلی کا آغاز کر کے اپنی اکتاہٹ اور ٹھہراؤ کو دور کرے۔ کہتے ہیں:

محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بے دماغی ہے
کہ موجِ بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا۵۶

سارتر کے مطابق جب بے کسی، بے چارگی اور اکتاہٹ کا غلبہ بڑھ جاتا ہے تو انسان مایوسی اور نا امیدی کی کیفیت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ غالبؔ بھی جب نامساعد حالات سے دوچار ہوتے ہیں تو ان کی امیدیں دم توڑ دیتی ہیں۔ کہتے ہیں:

کہتے ہیں جیتے ہیں اُمید پہ لوگ
ہم کو جینے کی بھی اُمید نہیں۵۷

لیکن سارتر کے مطابق اس مقام پر نا امیدی اور مایوسی منفی نہیں، بلکہ مثبت قوتیں ہیں۔ یہ اعتراض کہ وجودیت انسان کو مایوسی میں مبتلا کر دیتی ہے، کے جواب سارتر کہتے ہیں کہ مایوسی انسان کو دوبارہ نئے سرے سے جدوجہد کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ غالبؔ بھی نا امیدی سے رنجیدہ نہیں ہوتے، بلکہ ان کے نزدیک انسان کا نا امیدی کی حالت میں کفِ افسوس ملنا نئے سرے سے تجدیدِ تمنا کا اقرار کرنا ہے:

نہ لائی شوخیِ اندیشہ تابِ رنجِ نومیدی
کفِ افسوس ملنا عہدِ تجدیدِ تمنا ہے۵۸

اس بات کی وضاحت میں جوش ملسیانی لکھتے ہیں: ''گویا کفِ افسوس ملنا، نا اُمیدی کی وجہ سے نہیں، بلکہ یہ تمنا کے ہاتھ پر دوبارہ بیعت کرنا ہے۔''۵۹ غالبؔ کہتے ہیں: ''آدمی کو موافق اس کی تمنا کے آرزو بر آنی بہت محال ہے۔''۶۰ اس لیے اس مقام پر بھی سارتر کی طرح رجائی پہلو کو سامنے رکھتے ہوئے نا امیدی کو باعث راحت مانتے ہیں:

رنجِ نومیدیٔ جاوید! گوارا رہیو
خوش ہوں گر نالہ زبونی کشِ تاثیر نہیں[۶۱]

غالبؔ اپنی بے سود کوششوں میں بھی لذت محسوس کرتے ہیں اور جدوجہد کا سلسلہ جاری رکھنا چاہتے ہیں۔وہ کہتے ہیں۔

بس ہجوم ناامیدی ،خاک میں مل جائے گی
یہ جو اک لذت ہماری سعیٔ بے حاصل میں ہے[۶۲]

سارتر کے مطابق مایوسی اورناامیدی انسان کوعمل پرآمادہ کرتی ہیں۔ان کے بقول''اگر امید کوئی چیز ہے تو وہ اس (انسان) کےعمل میں ہے۔''[۶۳]غالبؔ کوبھی عملی زندگی میں اس مرحلے سے بارہا گزرنا پڑا،کیونکہ خاندانی پنشن کے معاملے میں کئی بار مایوسی کا منہ دیکھنا پڑا،لیکن ہتھیارنہیں ڈالے اورامید کا دامن تھامے رہے۔وہ یاس کے ماروں کو پیغام دیتے ہوئے کہتے ہیں۔

نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ
اگر شراب نہیں انتظارِ ساغر کھینچ[۶۴]

سارتر کی طرح غالبؔ کے نزدیک بھی اُمید اور آرزو کی شمع ہمیشہ دل میں روشن رکھنی چاہیے،کیونکہ اُمید کی روشنی ہی زندگی کی علامت ہے۔ڈاکٹرشوکت سبزواری کی رائے اس حوالے سے خاصی معنی خیز ہے:

''آس کا تانابانا یاس کے ریشوں سے تیارہواہے۔بہارکی ترکیب میں خزاں کے جراثیم پائے جاتے ہیں۔جوش اورجہدسبب ہے ناکامی اورخسران کا۔''[۶۵]

سارتر کے نزدیک ناامیدی سے مراد یہ ہے کہ انسان کوکسی امید اور صلے کی پرواہ کیے بغیرعمل کرنا چاہیے۔غالبؔ بھی ستائش کی تمنا اور صلے کی پرواہ کیے بغیرعمل کرتے ہیں اورعمل کا بدلہ چاہنے والوں کو ناپسند کرتے ہیں۔

کیا زہد کو مانوں کہ نہ ہو گر چہ ریائی
پاداشِ عمل کی طمعِ خام بہت ہے[۶۶]

سارتر کی طرح غالبؔ کواس بات سے کوئی غرض نہیں کہ ان کی امیدیں برآئیں گی بھی کہ نہیں ،لیکن پھربھی جبرِ مسلسل کاٹ کر نیرنگِ تمنا کے تماشائی بنے ہوئے ہیں۔دراصل وہ زندگی کے رزمِ خیروشر سے خود کو نکالنا پسندنہیں کرتے ،اورلہوگرم رکھنے کے بہانے تلاش کرتے ہیں۔

ہوں میں بھی تماشائیٔ نیرنگِ تمنا
مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب ہی بر آوے[۶۷]

اُن کے نزدیک اُمید صرف اس لیے رکھنی چاہیے کہ اس کے بل بوتے پرعمر گزرجائے گی ۔قیامت میں بھی اگر اُمیدیں بر نہ آئیں تو کوئی پرواہ نہیں ،یہ بھی غنیمت ہے کہ امیدوں کے سہارے دنیا کی زندگی جینے میں مدد ملے گی اور اس کا گزرجانا دشوار نہ ہوگا۔

ہے غنیمت کہ بامید گزر جائے گی عمر
نہ ملے داد ، مگر روزِ جزا ہے تو سہی[۶۸]

یہ اعتراض کہ وجودیت انسان کو تنہائی کے اندھے غار میں دھکیل دیتی ہے، کے جواب میں سارتر کہتے ہیں: ''اگر خدا کا کوئی وجود نہیں۔اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان تنہا ہے۔''۶۹؎ کیونکہ وہ اپنے اندر یا باہر کوئی ایسی شے نہیں پاتا جس پر وہ بھروسہ کرے اور مصیبت میں اس کو پکارے، لیکن ان کے مطابق تنہائی کا احساس انسان کی تکمیل کے لیے ضروری ہے۔اس مقام پر اسے اپنی زندگی کے پیچیدہ مسائل کو سلجھانے کا بہترین موقع ملتا ہے۔تنہائی کا یہ احساس تعمیری ہے۔تنہائی میں بیٹھ کر انسان اپنے مستقبل کی منصوبہ بندی کرتا ہے اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ عالمِ تنہائی کی اکتاہٹ، شبِ تنہائی کی تاریکی اور تمام مسائل کا حل نکالنے والا صرف اور صرف اس کی اپنی ذات ہی ہے۔ بقول عرش صدیقی:

''یہ تنہائی تو انسان کو اس کے انفرادی وجود کی اہمیت کا احساس دلا کر اسے ایک گونہ اطمینان عطا کرتی ہے۔۔۔تنہائی ہمارے وجود کا حصہ ہے اور اسی طرح بے چینی اور کرب ضروری ہونے کے ساتھ ساتھ تعمیری قوتیں ہیں۔''۷۰؎

غالبؔ کے یہاں بھی تنہائی کا احساس تعمیری ہے۔ان کے مطابق تنہائی کی انجمن انسان کی تقدیر ہے کہ یہی انسان کے لطیف اور جمیل احساسات کی تخلیق کا سرچشمہ ہے۔غالبؔ تنہائی پسند ہیں حتیٰ کہ وہ اپنے اہل وعیال کو بھی اپنی تنہائی میں رکاوٹ سمجھتے ہیں۔ان کے مطابق:

''ہر شخص کو غم موافق اس کی طبیعت کے ہوتا ہے۔ایک کو تنہائی سے نفور ہے،ایک کو تنہائی منظور ہے۔تاہل میری موت ہے۔ میں کبھی اس گرفتاری سے خوش نہیں رہا۔''۷۱؎

سارتر کی طرح غالبؔ بھی اس بات کے قائل ہیں کہ تنہائی میں انسان کی انفرادی قوتیں اُبھرنے لگتی ہیں۔ ان کے مطابق انسان محشرِ خیال ہے اور تنہائی اور خلوت میں بھی اپنی ذات کے اندر انجمن کی حیثیت رکھتا ہے؎

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو۷۲؎

غالبؔ تنہائی کے اندھیروں کو روشنی بخش کر اپنے دل کو مردہ ہونے سے بچاتے ہیں۔ ان کے خیال میں تنہائی کے لمحات انسان کے لیے ان معنوں میں بھی مفید ہیں کہ انسان کو دیگر مسائل سے بے نیاز ہو کر آرام اور سکون سے سوچنے کا موقع مل جاتا ہے؎

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے۷۳؎

سارتر کے مطابق انسان کو بے چارہ اور مجبور بنانے والا سب سے بڑا خوف موت کا خوف ہے۔ان کے نزدیک جب انسان زندگی کے اختصار پر سوچتا ہے اور موت کو یاد کرتا ہے تو اسے تکلیف ہوتی ہے۔انسان فطری طور پر زندگی سے پیار اور موت سے خوف محسوس کرتا ہے۔ یہاں وہ اپنی ان تمام خواہشات کی تکمیل چاہتا ہے جو برسوں سے ناآسودہ اور تکمیل طلب ہوتی ہیں۔اس لیے تو غالبؔ کہتے ہیں؎

لے گئے خاک میں ہم داغِ تمنائے نشاط
تو ہو اور آپ بہ صد رنگ گلستاں ہونا۷۴؎

سارتر کی طرح غالبؔ بھی زندہ رہنا چاہتے ہیں اور زندگی کا انجام سوچ کر ایک لمحے کے لیے گھبرا بھی جاتے ہیں۔ سارتر کے نزدیک انسان آزادی پسند ہے اور موت اس سے آزادی چھین لیتی ہے۔ان کے نزدیک فنا ایک لحاظ سے جسم خاکی کے لیے وسیلہ آسودگی بھی ہے مگر خوفِ فنا اور اندیشۂ مرگ زندگی بھر انسان کے لیے باعث خلش بھی بنا رہتا ہے۔ بقول غالبؔ؎

تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا
مرنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا۵؎

سارتر نے موت کے خوف سے نجات کا جو راستہ بتایا ہے وہ غالبؔ کے یہاں بھی اسی صورت میں موجود ہے۔دونوں نے موت کے خوف سے بچنے کا یہ طریقہ بتایا ہے کہ موت سے ڈرنے کے بجائے اسے اپنے وجود کا ایک لازمی حصہ تسلیم کر لیا جائے۔غالبؔ بھی موت کی حقیقت کو تسلیم کر کے اس کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہیں۔ان کے بقول:''یہ سب جانتے ہیں کہ روح کا تعلق جسم سے جاودانی نہیں۔''۶؎ مزید کہتے ہیں؎

رہا گر کوئی تا قیامت سلامت
پھر اک روز مرنا ہے حضرت سلامت۷؎

سارتر انسانی زندگی کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ان کے مطابق زندگی کے ان مختصر لمحات میں بہت زیادہ عمل اور محنت کی ضرورت ہے۔ان کے مطابق موت کا تصور انسان کو عمل پر اُکساتا ہے، کیونکہ جب انسان کو موت کا خوف لاحق ہوگا تو وہ زندگی سے زیادہ سے زیادہ لطف حاصل کرے گا۔ اس کی خواہشات میں اضافہ ہوگا اور اس طرح وہ اس چندروزہ زندگی میں بہت سے کام جلد از جلد نمٹانا پسند کرے گا۔

غالبؔ بھی موت سے پہلے زندگی کے ایک ایک پل کی قدر و قیمت واضح کرتے ہیں۔ وہ موت کو زندگی کے لیے خطرہ تصور نہیں کرتے بلکہ اس کے ساتھ مسرت افزا اُمیدیں وابستہ کرتے ہیں۔معمولی سا خوشی کا لمحہ بھی ان کو خوش کرنے کے لیے کافی ہے۔ وجودیوں کی طرح غالبؔ کا پیغام بھی یہی ہے کہ دوروزہ عمر کو انساں نہ رائیگاں کاٹے۔وہ زندگی کے ایک ایک پل کو غنیمت سمجھ کر گزارنے کے قائل ہیں۔ کہتے ہیں؎

عشرتِ صحبتِ خوباں ہی غنیمت سمجھو
نہ ہوئی، غالبؔ اگر عمرِ طبیعی، نہ سہی۸؎

غالبؔ درد و الم، آہ و فریاد اور مصائب و آلام کو بھی غنیمت سمجھتے ہیں، کیونکہ ان کے نزدیک ایسا وقت بھی آنے والا ہے جب سب کچھ مٹ جائے گا۔ پھر نہ یہ وجود رہے گا اور نہ آہ و فریاد کے لمحے باقی رہیں گے؎

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے
بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن۹؎
دلا! یہ درد و الم بھی تو مغتنم ہے، کہ آخر
نہ گریۂ سحری ہے، نہ آہِ نیم شبی ہے ۱۰؎

غالبؔ انسانی زندگی کے علاوہ مظاہرِ فطرت سے بھی اچھی طرح محظوظ ہونا چاہتے ہیں اور اسے دیکھنے کا موقع ضائع

نہیں کرنا چاہتے۔

بخشے ہے جلوۂ گل ذوقِ تماشا غالبؔ
چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا۸۱؎

غالبؔ حیاتِ انسانی کے پل پل پر مر مٹنے کو تیار ہیں۔سارتر کی طرح غالبؔ بھی جانتے ہیں کہ زندگی صرف ایک بار ملتی ہے،اس لیے اسے کسی صورت کھونا نہیں چاہتے۔کہتے ہیں۔

یاربّ زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں۸۲؎

غالبؔ دیوانگی کی حد تک ذوقِ ہستی پر مر مٹنے کو تیار ہیں اور حیاتِ انسانی کے اس حد تک قائل ہیں کہ حیات دہر کے بدلے جنت کو بھی کم مایہ سمجھتے ہیں اور کسی صورت بھی زندگی کا سودا کرنے کو تیار نہیں۔

دیتے ہیں جنت حیات دہر کے بدلے
نشہ بہ اندازۂ خمار نہیں ہے۸۳؎

اس حوالے سے ڈاکٹر انور سدید کی رائے کافی اہمیت کی حامل ہے:

''وہ (غالبؔ) زندگی کو اپنی تمام لطافتوں اور کثافتوں کے ساتھ قبول کرتا ہے۔۔اور اس (زندگی) کے اثمار ولذائذ سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کا خواہش مند ہے۔''۸۴؎

غالبؔ سارتر کی طرح زندگی سے لطف بھی حاصل کرتے ہیں لیکن حیات کی قلت کو مدِ نظر رکھ کر موت سے پہلے دعوتِ عمل پر بھی زور دیتے ہیں۔ان کے نزدیک دنیا کی تمام چیزیں انسان کے لیے پیدا کی گئی ہیں اور انسان کو ہی ان کو تسخیر کر کے اپنے مفاد کے لیے استعمال کرنا چاہیے۔

یک ذرۂ زمیں نہیں بے کار باغ کا
یاں جادہ بھی فتیلہ ہے لالے کے داغ کا۸۵؎

غالبؔ زندگی میں سکوت اور جمود کے قائل نہیں۔ان کے یہاں زندگی عمل کا نام ہے اور ہر دم جواں ،پیہم رواں ہے۔ان کے نزدیک حیاتِ انسانی میں ٹھہراؤ اور سکوت وجمود انسانیت کی موت ہے۔وہ سارتر کی طرح انسان اور انسانیت کی معراج کا ضامن عمل ہی کو ٹھہراتے ہیں۔ان کے نزدیک بے کار بیٹھ انسان کی صلاحیتیں ختم ہو جاتی ہیں۔وہ حضرت حضرؑ پر اس لیے طنز کرتے ہیں کہ وہ کشمکش حیات سے منہ موڑ کر روپوش ہو گئے ہیں اور غالبؔ کے نزدیک طوفانِ حوادث سے منہ موڑ کر روپوش ہونا عین مرگ ہے۔

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لیے۸۶؎

غالبؔ بہت وسیع مشاہدے کے مالک تھے۔ماضی اور مستقبل پر ان کی نظر گہری تھی۔مستقبل میں برپا ہونے والے انقلابات کو انھوں نے اچھی طرح سے محسوس کیا تھا،اس لیے انھوں نے ہر جگہ مستقبل کے حوالے سے منصوبہ بندی اور عمل پیرا

ہونے کی تلقین کی ہے۔

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اُٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی۸۷

غالبؔ فرصتِ ہستی پر توجہ دے کر حیات کو محترم بناتے ہیں۔وہ زندگی کے یہ قیمتی لمحے رسمی قسم کی عبادت میں بھی گزارنے کے قائل نہیں۔ اُن کے مطابق رسمی عبادت میں وقت گزارنے سے بہتر ہے کہ زندگی کے یہ قیمتی لمحے، زندگی کو مفید بنانے کے میں صرف ہو جائیں۔

مٹتا ہے فوتِ فرصتِ ہستی کا غم کوئی
عمرِ عزیز صرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو۸۸

اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے سید محمد محمود رضوی مخمورؔ اکبر آبادی اپنی کتاب ''سروصنوبر'' میں کہتے ہیں:

''اس شعر میں 'عبادت' ایک ذیلی بات ہے۔اصل میں 'فرصتِ ہستی' کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔اس پر اصرار ہے کہ زندگی کی مدت کو غنیمت جانو اور تخلیقی کاموں میں صرف کرو۔''۸۹

غالبؔ زندگی جینے میں پوری وارفتگی دکھاتے ہیں۔مسلسل سفر کے باعث وہ تھک کر ہمت نہیں ہارتے، بلکہ ایک بیاباں کی مسافت طے کرنے کے بعد دوسرے کی طرف قدم بڑھاتے ہیں۔ایک مشکل کو حل کر کے دوسرے کی طرف بڑھتے ہیں۔

نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا
حبابِ موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا۹۰

غالبؔ کے نزدیک جو کام ابھی رہتے ہیں، وہ ہر حال میں مکمل کرنے چاہیے۔ان کے نزدیک زندگی کی جتنی مشکل گرہیں کھلنی ابھی باقی ہیں ان کو بھی کھولنا ضروری ہے اور اس کے لیے کاوشِ ناخن سے کام لینا چاہیے۔

کاوش کا دل کرے ہے تقاضا کہ ہے ہنوز
ناخن پہ قرض، اِس گرہِ نیم باز کا۹۱

سارتر سکون و راحت کے حصول کے لیے محنت اور عمل کی ضرورت پر زور دیتے ہیں۔غالبؔ کے نزدیک بھی نازِ بستر کھینچ کر انتظار کرنے سے راحت نہیں ملتی، بلکہ اس کے لیے صحرانوردی اور سخت محنت اور جدوجہد کی ضرورت ہے۔تن آسانی اور آرام طلبی سے مقصود ہاتھ نہیں آتا۔

تجھے بہانۂ راحت ہے انتظار، اے دل!
کیا ہے کس نے اشارا کہ نازِ بستر کھینچ۹۲

سارتر کے مطابق چونکہ انسان کی موت کے بعد اس کے ادھورے کام دوسرے لوگ بھی مکمل نہیں کر سکتے، کیونکہ وہ اپنے ہی کاموں میں مصروف ہوتے ہیں، اس لیے موت سے پہلے ہر انسان کو زیادہ محنت کر کے اپنے تمام کام خود مکمل کرنے چاہیے۔ان کے مطابق:

''میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ میرے ساتھی میری موت کے بعد میرا کام سنبھال لیں گے اور اسے انتہائی

کمال پر پہنچا دیں گے۔''۹۳

غالبؔ بھی مسلسل محنت اور لگن کے قائل ہیں ۔محنت بھی کوئی عام نہیں ، بلکہ ان کے بقول:''محنت وہ ہے کہ دن رات میں فرصت کام سے کم ہوتی ہے ۔''۹۴ وہ بھی سارتر کی طرح موت سے پہلے بہت کام کرنا چاہتے ہیں۔زندگی کے اختصار کے باوجود سخت محنت اور لگن سے اپنے سارے منصوبوں اور ادھورے کاموں کی ہر صورت میں تکمیل چاہتے ہیں اور موت سے بڑی حسرت سے التجا کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اے مرگ
رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے ۹۵

اس حوالے سے محمد موسیٰ خان کلیم کہتے ہیں:

''یہ خونِ جگر آنکھ کے راستے ٹپکا دینا زندگی کے مہیب ارادوں کی تکمیل میں خوں فشانی کے مترادف ہے ۔شاعر کی سب سے بڑی حسرت یہی ہے کہ وہ اپنے عظیم ارادوں کی تکمیل نہیں کر پائے گا اور دامنِ حیات ہاتھ سے چھوٹ جائے گا۔''۹۶

سارتر کے مطابق موت کا خوف لاحق نہ ہونے سے انسانی زندگی میں ٹھہراؤ آ جاتا ہے۔ان کے نزدیک موت کا شعور دراصل دعوتِ عمل ہے ۔یعنی موت سے پہلے تمام انسان اپنی تمام خواہشات کی تکمیل کے لیے سر دھڑ کی بازی لگائیں گے اور ارتقاء کا سلسلہ تیزی سے آگے بڑھے گا۔غالب کے ہاں بھی یہی کچھ موجود ہے۔ان کے مطابق دنیا کی چہل پہل اور رونق فنا ہی کے دم سے ہے ۔اور بقول شان الحق حقی :'' اسے (انسان) کو مرنے کے خیال میں جینے کا مزا ملتا ہے ۔''۹۷ جبکہ ڈاکٹر شوکت سبزواری کہتے ہیں :''کام کرنے کے حوصلے، ہنگامہ آفرینیاں ،نبرد آزمائیاں اور طبیعتوں میں نشاط اور امنگیں صرف ایک فنا کی برکت سے ہیں۔''۹۸

اگر موت نہ ہو تو زندگی کی رنگارنگی خود بخود ختم ہو جائے گی اور انسان کا دل زندگی کی یکسانیت سے بے زار ہو جائے گا۔غالبؔ بھی موت کو سامنے دیکھ کر زندگی سے زیادہ سے زیادہ لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ عمل اور محنت پر زور دیتے ہیں۔کہتے ہیں۔

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا ۹۹

سارتر کی طرح غالبؔ نے بھی زندگی کی بے ثباتی کے خوف کا علاج ،جوشِ آرزو میں پایا ہے۔ان کے یہاں یہ باتیں صرف کہنے سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ انھوں نے زندگی میں اس کا عملی مظاہرہ کیا ہے ۔انھیں تن آسانی پسند نہیں تھی ۔زندگی کے آخری ایام میں جبکہ ان کی قویٰ مضمحل ہو گئے ،مختلف قسم کی بیماریوں نے انھیں گھیر لیا اور عناصر میں اعتدال باقی نہیں رہا ،اس حالت میں بھی آرام سے نہیں بیٹھے۔ایک خط میں لکھتے ہیں :

''قریب بمرگ ہوں دونوں ہاتھوں میں پھوڑے ہیں ، پانو میں ورم ہیں ۔نہ وہ اچھے ہوتے ہیں ،نہ یہ رفع ہوتا ہے ۔بیٹھ نہیں سکتا ۔لیٹے لیٹے لکھتا ہوں۔''۱۰۰

غالبؔ زندگی کی قدر و قیمت کو سارتر سے بھی زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور اس مقام پر وہ وجودیوں سے بھی بڑے وجودی نظر آتے ہیں، کیونکہ زندگی کے اس مقام پر جب ہاتھ پاؤں میں حرکت باقی نہ رہے اور انسان مرنے کی آرزو میں مرتا ہے، اپنے بس کے مطابق زندگی کی رنگینی سے فائدہ اٹھانے کے خواہاں ہیں۔

گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے!
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے ۱۰۱؎

اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر سید عبداللہ کہتے ہیں:

''اس ''ابھی'' میں بڑے بعید زمانوں کا اشارہ ملتا ہے۔یعنی اس وقت تک کا جس کے بعد ''ابھی'' کہنے کی کوئی صورت ہی نہ رہے۔'' ۱۰۲؎

اور جب ان کے ہاتھ میں جنبش اور عناصر میں اعتدال باقی نہیں رہتا،قویٰ مضمحل اور بینائی ضعیف ہوجاتی ہے اور ''ابھی'' کہنے کی بھی ضرورت باقی نہیں رہتی تو اس مقام پر بھی غالبؔ اس چاردن کی زندگی کو خیر باد کہنے پر آمادہ نہیں ہوتے اور بڑے افسوس کے ساتھ ''بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے'' کہتے کہتے عیشِ دنیا کی حسرت کے بے شمار داغ لے کر دنیا سے رُخصت ہوجاتے ہیں:

جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لیے ہوئے
ہوں شمعِ کشتہ درخورِ محفل نہیں رہا ۱۰۳؎

غالبؔ داغِ حسرتِ ہستی لیے ہوئے جاتے تو ہیں،لیکن ذوق وشوقِ عمل کا سلسلہ پھر بھی ختم نہیں ہوتا،اور مرنے کے بعد بھی درسِ عمل دیتے ہوئے کہتے ہیں:

اللہ رے ذوقِ دشت نوردی کہ بعدِ مرگ
ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پاؤں ۱۰۴؎

زندگی کے ہنگامے فطری طور پر اپنے ساتھ دُکھ،مصائب وآلام اور بلائیں ہمراہ لاتے ہیں۔غالبؔ کے نزدیک زندگی سے لطف کے حصول کے لیے ان بلاؤں کو ہم آغوش کرنا پڑتا ہے۔خطرات جھیل کر ہی انسان مقصد تک رسائی حاصل کرتا ہے۔ مایوسی،ناامیدی،موت کے خوف کو پس پُشت ڈال کر ہی زندگی سے سرور کے لمحے کشید کیے جاسکتے ہیں اور یہی وجودیت کا فلسفہ ہے۔ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

''اس راستے میں ناامیدی،تجدید تمنا کا بہانہ ہے۔۔اور ناکامی سعی کامیابی کے لیے مہمیز،زندگی جینے کی آرزو اور اس شدت کا نام ہے۔۔اور اس سے بڑھ کر اور بہتر خوفِ مرگ اور بے ثباتی کا کوئی جواب نہیں۔'' ۱۰۵؎

غرض غالبؔ اپنی وہبی اور تعقلی صلاحیتوں کے بل پر وجودیت کے اُن افکار ونظریات تک پہنچ چکے تھے،جنھیں مغربی وجودی فلسفیوں نے کافی عرصہ بعد جامع نظریاتی شکل میں مرتب ومنظّم کیا۔غالبؔ کا دور سیاسی،علمی،اقتصادی اور معاشی حوالے سے ابتری کا دور تھا،مگر اس زمانے میں بھی غالبؔ اپنی قابلیت کا ثبوت دیتے ہیں اور کچھ ایسی باتیں بیان کرتے ہیں جو مستقبل میں بیسویں صدی کے مغربی فکر وفلسفے کا حصہ بن جاتی ہیں۔غالبؔ کے وجودی فلسفے کی ابتدائی جھلکیوں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ

مشرقی مفکرین نے ہمیشہ دُنیا کو اپنے افکار کی روشنی سے منور کیا ہے۔غالبؔ کے بتائے ہوئے رموز و نکات کا گہرا تجزیہ کرنے کے بعد اکثر مغربی مفکرین و فلاسفہ کے فکری انکشافات قارئینِ ادب کے لیے کوئی نئی بات نہیں رہتے۔اس طرح یہ بات غلط ثابت ہوجاتی ہے کہ اہلِ مشرق،مغربی مفکرین کے مقلد ہیں۔ادب کے میدان میں بہت سے افکار مشرقی مفکرین کے ذاتی ہیں اور مغربی ادب سے پہلے مشرقی ادب میں جگہ پا چکے ہیں۔غالبؔ اپنی ہمہ جہت شخصیت، قابلیت، ذکاوت، علمی استعداد اور فکر و فلسفے میں پختگی کی بدولت عالمی رتبے کے مالک ہیں اور بلاشبہ عالمی شہرت یافتہ ادباء و شعراء کے صف میں کھڑے نظر آتے ہیں۔

حوالہ جات:

۱۔ سید محمد محمود رضوی مخمورؔ اکبرآبادی، سرو صنوبر، کراچی: مدینہ پبلشنگ کمپنی، س ن، ص:۲۹

۲۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، اطرافِ غالبؔ، لاہور: گلوب پبلشرز، ۱۹۶۸ء، ص:۱۵۲

۳۔ قاضی جاوید، وجودیت، لاہور: فکشن ہاؤس، دوسرا ایڈیشن، ۲۰۰۵ء، ص:۱۱

۴۔ اسد اللہ خاں غالبؔ، مشمولہ، خطوطِ غالبؔ، مرتبہ، غلام رسول مہرؔ، لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، بارسوم، ۱۹۶۲ء، ص:۳۰۸

۵۔ اسد اللہ خاں غالبؔ، دیوانِ غالبؔ، بہ تصحیحِ متن و ترتیب، حامد علی خاں، لاہور: الفیصل اُردو بازار، ۱۹۹۵ء، ص:۲۱

۶۔ وجودیت اور انسان دوستی، ژاں پال سارتر، مترجم ظہور الحق شیخ، مشمولہ، نئی تنقید، لاہور: سوندھی ٹرانسلیشن سوسائٹی گورنمنٹ کالج، ۱۹۶۹ء، ص:۲۸۱

۷۔ ایضاً، ص:۲۹۰

۸۔ ایضاً، ص:۲۶۹

۹۔ اسد اللہ خاں غالبؔ، مشمولہ، خطوط غالبؔ، ص:۱۵۸

۱۰۔ اسد اللہ خاں غالبؔ، دیوانِ غالبؔ، ص:۱۰۵

۱۱۔ وجودیت اور انسان دوستی، ژاں پال سارتر، مشمولہ، نئی تنقید، ص:۲۷۸

۱۲۔ اسد اللہ خاں غالبؔ، شرح کلیاتِ غالبؔ (فارسی) ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی، مکتبۂ دانیال، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص:۴۱

۱۳۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، اطرافِ غالبؔ، ص:۱۲۰

۱۴۔ اسد اللہ خاں غالبؔ، کلیات غالبؔ فارسی (جلد سوم) مرتبہ سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۷ء، ص:۱۶۴

۱۵۔ اسد اللہ خاں غالبؔ، دیوانِ غالبؔ، ص:۱۴۲

۱۶۔ ایضاً، ص: ۱۲۰

۱۷۔ اسداللہ خاں غالبؔ،مشمولہ،خطوط غالبؔ،ص:۲۳۷

۱۸۔ وجودیت اور انسان دوستی،ژاں پال سارتر،مشمولہ،نئ تنقید،ص:۲۷۴

۱۹۔ ایضاً،ص:۲۷۴

۲۰۔ اسداللہ خاں غالبؔ، دیوانِ غالبؔ،ص: ۲۷

۲۱۔ ایضاً،ص: ۱۳۶

۲۲۔ اسداللہ خاں غالبؔ،مشمولہ،خطوط غالبؔ،ص:۶۹

۲۳۔ ایضاً،ص: ۱۷۸

۲۴۔ ایضاً،ص:۲۳۷

۲۵۔ اسداللہ خاں غالبؔ، دیوانِ غالبؔ،ص:۶

۲۶۔ اسداللہ خاں غالبؔ، دیوانِ غالبؔ،نسخۂ طاہر،مرتبہ،گوہر نوشاہی، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۶۹ء،ص:۴۷

۲۷۔ اسداللہ خاں غالبؔ، دیوانِ غالبؔ،ص:۲۱

۲۸۔ ایضاً،ص: ۵۱

۲۹۔ ایضاً،ص: ۹۸

۳۰۔ ایضاً،ص:۱۵۵

۳۱۔ ایضاً،ص:۱۱۴

۳۲۔ ایضاً،ص:۸۰

۳۳۔ ایضاً،ص:۶۹

۳۴۔ ایضاً،ص:۱۷۰

۳۵۔ عرش صدیقی ، وجودیت کیا ہے؟ مشمولہ، ادبی دنیا ، لاہور ،طبع دوم ، خاص نمبر۱۲ ، بہار ،۱۹۶۴ء دور پنجم ،شمارہ دواز دہم،ص: ۲۵۵

۳۶۔ اسداللہ خاں غالبؔ، دیوانِ غالبؔ،ص:۱۲۸

۳۷۔ ایضاً،ص:۸۲

۳۸۔ ایضاً،ص:۶۴

۳۹۔ وجودیت اور انسان دوستی،ژاں پال سارتر،مشمولہ،نئ تنقید،ص: ۲۶۹

۴۰۔ اسداللہ خاں غالبؔ،مشمولہ،خطوط غالبؔ،ص:۴۰۶

۴۱۔ اسداللہ خاں غالبؔ، دیوانِ غالبؔ،ص:۶

۴۲۔ ایضاً،ص:۱۷۵

۴۳۔ اسداللہ خاں غالبؔ،مشمولہ خطوطِ غالبؔ،ص: ۱۱۹

۴۴۔ ایضاً،ص:۲۳۱
۴۵۔ ناصؔر کاظمی، خشک چشمے کے کنارے، مکتبۂ خیال، لاہور،۱۹۸۲ء،ص:۱۲۸
۴۶۔ اسداللہ خاں غالبؔ، دیوانِ غالبؔ،ص:۸۳
۴۷۔ اسداللہ خاں غالبؔ،مشمولہ،خطوط غالبؔ،ص:۲۳۷
۴۸۔ اسداللہ خاں غالب، دیوانِ غالبؔ،ص:۱۷۵
۴۹۔ ایضاً،ص:۹۸
۵۰۔ شررنعمانؔی،تائیدوتردید،غنی پرنٹرز، پشاور، ۱۹۷۶ء،ص:۱۷
۵۱۔ اسداللہ خاں غالبؔ، دیوانِ غالبؔ،ص:۸۱
۵۲۔ ایضاً،ص:۱۹۱
۵۳۔ ایضاً،ص:۱۸۸
۵۴۔ افتخار بیگ، کیا موضوعیت ہی صداقت ہے؟ مشمولہ، نگار، پاکستان،شمارہ: ۷ جولائی، ۲۰۰۷ء،ص:۴۲
۵۵۔ اسداللہ خاں غالبؔ،مشمولہ،خطوط غالبؔ،ص:۵۳۳
۵۶۔ اسداللہ خاں غالب، دیوانِ غالبؔ،ص:۱۰
۵۷۔ ایضاً،ص:۷۷
۵۸۔ ایضاً،ص:۱۱۷
۵۰۔ جوش ملسیانی،شرحِ دیوانِ غالبؔ،سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور،۲۰۰۳ء،ص:۲۶۲
۶۰۔ اسداللہ خاں غالبؔ،مشمولہ،خطوط غالبؔ،ص:۲۳۰
۶۱۔ اسداللہ خاں غالب، دیوانِ غالبؔ،ص:۵۷
۶۲۔ ایضاً،ص:۱۲۶
۶۳۔ وجودیت اور انسان دوستی،ژاں پال سارتر،مشمولہ،نئ تنقید،ص:۲۸۱
۶۴۔ اسداللہ خاں غالبؔ، دیوانِ غالب،ص:۴۵
۶۵۔ شوکت سبزواری، فلسفہ کلام غالب،قومی کتب خانہ، بریلی،س ن،ص:۵۸
۶۶۔ اسداللہ خاں غالبؔ، دیوانِ غالبؔ،ص:۱۸۶
۶۷۔ ایضاً،ص:۱۸۰
۶۸۔ اسداللہ خاں غالبؔ، دیوانِ غالبؔ،نسخۂ طاہر،ص: ۱۰۵
۶۹۔ وجودیت اور انسان دوستی،ژاں پال سارتر،مشمولہ،نئ تنقید،ص:۲۷۳
۷۰۔ عرش صدیقی، وجودیت کیا ہے؟ مشمولہ، ادبی دُنیا، لاہور،ص: ۲۴۶
۷۱۔ اسداللہ خاں غالبؔ،مشمولہ،خطوط غالبؔ،ص:۳۷۹

۷۲۔ اسداللہ خاں غالبؔ، دیوانِ غالبؔ، ص:۹۸
۷۳۔ ایضاً، ص:۱۸۶
۷۴۔ ایضاً، ص:۱۶
۷۵۔ ایضاً، ص:۶
۷۶۔ اسداللہ خاں غالبؔ، مشمولہ خطوطِ غالبؔ، ص:۳۵۲
۷۷۔ اسداللہ خاں غالبؔ، دیوانِ غالبؔ، ص:۴۲
۷۸۔ ایضاً، ص:۱۴۳
۷۹۔ ایضاً، ص:۴۳
۸۰۔ اسداللہ خاں غالبؔ، دیوانِ غالبؔ، نسخۂ طاہر، ص:۱۱۰
۸۱۔ اسداللہ خاں غالبؔ، دیوانِ غالبؔ، ص:۳۹
۸۲۔ ایضاً، ص:۸۹
۸۳۔ ایضاً، ص:۱۳۹
۸۴۔ انور سدید، ڈاکٹر، غالب کا جہاں اور، کاروانِ ادب، ملتان صدر، ۱۹۸۶ء، ص:۶۳
۸۵۔ اسداللہ خاں غالبؔ، دیوانِ غالبؔ، ص:۲۸
۸۶۔ ایضاً، ص:۱۸۸
۸۷۔ ایضاً، ص:۱۲۷
۸۸۔ ایضاً، ص:۹۸
۸۹۔ سید محمد محمود رضوی مخمورؔ اکبر آبادی، سروصنوبر، مدینہ پبلشنگ کمپنی، کراچی، س ن، ص:۲۲
۹۰۔ اسداللہ خاں غالبؔ، دیوانِ غالبؔ، ص:۱۰
۹۱۔ ایضاً، ص:۱۱
۹۲۔ ایضاً، ص:۴۱
۹۳۔ وجودیت اور انسان دوستی، ژاں پال سارتر، مشمولہ، نئی تنقید، ص:۲۷۸
۹۴۔ اسداللہ خاں غالبؔ، دیوانِ غالبؔ، ص:۱۸۶
۹۵۔ اسداللہ خاں غالبؔ، مشمولہ، خطوط غالبؔ، ص:۴۱۱
۹۶۔ محمد موسیٰ خان کلیمؔ، مقامِ غالبؔ، غیور احمد خان پروپرائٹر ادارہ ''نئی تحریریں''، پشاور، ۱۹۶۵ء، ص:۱۳۳
۹۷۔ شان الحق حقّی، نقد و نگارش، مکتبۂ اسلوب، کراچی، ۱۹۸۵ء، ص:۸۴
۹۸۔ شوکت سبزواری، فلسفہ کلام غالب، قومی کتب خانہ، بریلی، س ن، ص:۵۷
۹۹۔ اسداللہ خاں غالبؔ، دیوانِ غالبؔ، ص:۲۰

۱۰۰۔ اسداللہ خاں غالبؔ، مشمولہ، خطوط غالبؔ، ص:۲۰۳

۱۰۱۔ اسداللہ خاں غالبؔ، دیوانِ غالبؔ، ص:۱۷۰

۱۰۲۔ سیدعبداللہ، ڈاکٹر، اطرافِ غالبؔ، ص:۱۲۲

۱۰۳۔ اسداللہ خاں غالبؔ، دیوانِ غالبؔ، ص:۳۴

۱۰۴۔ ایضاً، ص:۱۰۰

۱۰۵۔ سیدعبداللہ، ڈاکٹر، اطرافِ غالبؔ، ص:۱۲۴